© rasailojaraid.com

یادرفتگان

★

اصغر عبداللہ

# مولانا محمد سعید الرحمن علوی رحمتہ اللہ علیہ

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔

موسم ابر آلود تھا اور اس میں آخر برسات کی سوگواری کا رنگ بھی گھل گیا تھا۔ میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ شاہ جمال کالونی سے گزر رہا تھا۔ جونہی مسجد شاہ جمال کا گول چکر نزدیک آیا میری آنکھوں کے سامنے مولانا سعید الرحمان علوی مرحوم کا نورانی چہرہ گھوم گیا۔ ناگہاں ایسے معلوم ہوا جیسے میں یاد کی پاتال میں اتر رہا ہوں، اتھاہ گہرائیوں میں۔ میں نے اپنے دوست سے درخواست کی کہ تھوڑی دیر کے لئے گاڑی روک لو تاکہ میں اس گوشۂ پر نور سے کچھ یادیں سمیٹ لوں۔ اس نے حیران آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور مسجد کی دیوار کے ساتھ گاڑی پارک کر دی۔ یہ غروب آفتاب کا وقت تھا۔

دفعتاً فضا میں مغرب کی اذان گونجی، خدا کی کبریائی کے کلمات بلند ہوئے اور نمازیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں سوچ رہا تھا یہ وہی مسجد ہے، وہی منظر ہے، لیکن تھی جو اس شخص کے تصور سے، اب وہ رعنائی خیال کہاں۔ میں چشم تصور سے مولانا کو ڈھونڈ رہا تھا، پر اب کہاں، وہ تو خاک میں پنہاں ہو کر لالہ و گل میں نمایاں ہو گئے تھے۔

بربط دل کے تار ٹوٹ گئے
کھو گئے راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل
بزم ہستی کے جام پھوٹ گئے

مولانا سعید الرحمان علوی نے ۱۹۴۵ء میں کوٹ حاکم خان سرگودھا میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد مولانا محمد رمضان علوی مقامی جامع مسجد میں خطیب اور امام تھے۔ جن کی نگرانی میں انہوں نے ۹ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تو انہیں مقامی سکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں سے انہوں نے ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی، یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے والد راولپنڈی کے محلہ اکال گڑھ (گلشن آباد) آ گئے تھے۔ سعید الرحمان علوی ساتویں جماعت کے امتحانات کے باعث رمضان المبارک میں قرآن حکیم کی تراویح سنا نہ سکے تو مولانا محمد رمضان علوی


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے انہیں سکول سے اٹھالیا اور خیر المدارس ملتان بھیج دیا جہاں انہوں نے مولانا محمد علی جالندھری اور سید ابوذر بخاری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور قاری رحیم بخش پانی پتی سے تجوید پڑھی، دورہ حدیث مدرسہ نصرت العلوم گوجرانولہ سے کیا اور مولانا حسین احمد مدنی کے فرزند ارجمند مولانا اسعد مدنی کی بیعت کر لی۔

۱۹۸۰ء میں دیوبند کی صد سالہ تقریبات میں مولانا تقی عثمانی کی قیادت میں جو وفد بھارت گیا، اس میں سعید الرحمان علوی اور ان کے بڑے بھائی (مولانا عزیزالرحمن خورشید) بھی شامل تھے۔

مولانا علوی نے مدرسہ حسینیہ میں مدرس کی حیثیت سے اپنی دینی خدمات کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے بعد وہ جامع مسجد حضرو کے خطیب ہوگئے۔ سات سال بعد وہ عید گاہ مسجد آئے۔ یہیں قیام کے دوران میں وہ جمعیت علماء اسلام کے ترجمان "خدام الدین" کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ جمعیت علماء اسلام، مفتی محمود گروپ اور مولانا غلام غوث ہزاروی گروپ میں بٹ گئی تو مولانا علوی مذہبی سیاست سے بددل ہوگئے۔ مولانا عبید اللہ انور جو "خدام الدین" کے ایڈیٹر تھے ان کا انتقال ہوا، ان کے بیٹے مولانا اجمل قادری، کرسئ صدارت پر براجمان ہوئے تو مولانا علوی کی داخلی کشمکش اور اضطراب میں اضافہ ہوگیا۔ مفتی محمود گروپ پر ان کی تنقید "خدام الدین" کی نئی انتظامیہ کے لئے ناقابل برداشت تھی انہیں "خدام الدین" سے علیحدہ ہونا پڑا، جو ان کے لئے شدید ترین جذباتی صدمہ تھا۔

یہ تنگی، عسرت اور اضطراب کا زمانہ تھا۔ غصہ اور نفرت ان کے دل و دماغ میں جمع ہوتے گئے۔ طبقۂ علماء سے وہ دلبرداشتہ ہوگئے۔ اگست ۷۵ء میں وہ مسجد دارالشفاء شاہ جمال لاہور آگئے۔ یہ خوشحال اور آسودہ حال لوگوں کی بستی تھی۔ ادھر مولانا سعید الرحمان علوی ترقی پسند نظریات کی زد میں تھے۔ وہ سیکولر طرز فکر سے متاثر ہورہے تھے۔ پیپلز پارٹی اور ترقی پسند جماعتوں کے لئے ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا اس کے برعکس مسلم لیگ اور مذہبی جماعتوں کے لئے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ اس طرز فکر کے باعث شاہ جمال ایسی آسودہ حال لوگوں کی بستی میں ان کے لئے کئی مسائل پیدا ہوگئے۔ ان کی حق گوئی بھی ان کے لئے مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ ایک بار انہوں نے روزنامہ "پاکستان" میں مساجد کے انتظامی امور کے بارے میں بے خوف اظہار کر دیا۔ مسجد میں ان کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ انہیں سخت وارننگ دے دی گئی۔ اس پر وہ اتنے بددل ہوئے کہ انہوں نے سنجیدگی سے مسجد شاہ جمال سے علیحدگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

قیام لاہور کے دوران میں تقریباً ایک سال وہ تنظیم اسلامی سے وابستہ رہے۔ انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد کی بیعت بھی کر لی تھی۔ ان کے حلقۂ احباب کو تنظیم اسلامی سے ان کی وابستگی پر حیرت تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر اسرار احمد کی تنگنائے بیعت میں مولانا سعید الرحمان علوی ایسے بندۂ حر کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد سے علیحدگی اختیار کر لی۔ وہ کہا کرتے تھے ڈاکٹر اسرار


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احمد سے وابستگی کے تجربے نے مذہبی پروہتوں کے بارے میں ان کے تصورات کو اور پختہ کر دیا ہے۔ اب انہوں نے اپنے آپ کو درس و تدریس اور حلقۂ دوستاں تک محدود کر لیا تھا اور آخر وقت تک انہوں نے اپنے معمولات اور خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔ اپنی ڈگر پر چلتے رہے۔

لاہور میں چند ہی لوگ ہیں جو عربی زبان و ادب میں مولانا علوی کی برابری کا دعویٰ کر سکتے، علمی حلقوں میں ان کی سربلندی کبھی متنازعہ نہیں رہی، میں سمجھتا ہوں اگر وہ اپنے علم دین کو جنس بازار بنانے پر آمادہ ہو جاتے تو وہ بھی المورد، قرآن اکیڈمی اور منہاج القرآن ایسے پر تعیش مذہبی ادارے کے بانی اور مالک بن سکتے تھے۔ ان کی طبیعت دنیاداری سے کوسوں دور تھی۔ ہر چند کہ ان کی دوست داری ان کی علمی سرگرمیوں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی، اس کے باوصف، انہوں نے کئی عربی کتابوں کے تراجم کئے۔ انہوں نے کیمیائے سعادت کا اردو ترجمہ اور احیاء العلوم کا انڈکس مرتب کیا۔ لاہور میں کئی لوگوں کا علمی بھرم انہی نے قائم رکھا ہوا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اہل علم و عمل کا حوالہ تھے۔

وہ گم ہوا تو مضامین ہو گئے بے ربط
وہی تو تھا، جو میرا مرکزی حوالہ تھا

زندگی کے آخری برسوں میں انہوں نے روزنامہ پاکستان میں باقاعدگی کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ نہایت معمولی معاوضے پر انہوں نے وقیع مضامین لکھے، آخری عمر تک یہ سلسلہ برقرار رہا۔ اپنی زندگی کی آخری طویل تحریر انہوں نے قومی ڈائجسٹ کے غوث اعظم نمبر کے لئے لکھی جواب شائع ہو گئی ہے۔ مولانا سعید الرحمن علوی نسلاً اور طبعاً احراری تھے۔ لہجے کی چمک اور جذبے کی آنچ ان کے مزاج میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور چودھری افضل حق کی عقیدت عمر بھر ان کے دل میں موجزن رہی۔ پبلک پلیٹ فارم پر بھی وہ اپنی عقیدت کا اظہار کرنے سے گریز نہ کرتے۔ وہ اچانک ناراض ہو کر اچانک من جانے والی شخصیت تھے۔ عجلت پسندی ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی اگر کسی کی کوئی بات انہیں ناپسند ہوتی تو وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر اپنے جذبات صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتے۔ اسی جذباتیت کے باعث بعض اوقات ان کے لئے پریشان کن صورت حال پیدا ہو جاتی، خود انہیں بھی افسوس ہوتا۔ آخری دنوں میں انہوں نے ایسے احباب سے خود جا کر معذرت کی جن کے بارے میں کسی زمانے میں وہ ناقدانہ قلم اٹھا چکے تھے۔

مولانا سعید الرحمن علوی سے میری پہلی ملاقات ہفت روزہ "ندا" کے دفتر میں ہوئی۔ وہ اس کے مستقل قلمی معاون تھے۔ عام طور پر وہ اپنا مضمون دینے کے لئے خود تشریف لاتے۔ ان کی تحریروں میں تمہید غیر معمولی طویل ہوتی تھی۔ ہم شکایت کرتے کہ اتنا طویل نہ لکھا کریں تو وہ مسکرا کر کہتے آپ مدیرانہ اختیارات استعمال کر کے اسے مختصر کر لیں۔ مجھ میں اتنی اہلیت کہاں تھی کہ ان کی تحریر کو قلم لگاتا ناچار یہ فریضہ مقبول الرحیم مفتی کو ادا کرنا پڑتا۔


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہفت روزہ "زندگی" سے وابستہ ہو گیا۔ یہ بے نظیر بھٹو کا پہلا دور حکومت تھا۔ پیپلز پارٹی ۱۱ سال بعد دوبارہ برسراقتدار آئی تھی "زندگی" پیپلز پارٹی اور بے نظیر حکومت کا سخت ترین ناقد تھا۔ مولانا سعید الرحمن علوی کو "زندگی" کی پالیسی سے اختلاف تھا۔ اپنی گفتگوؤں میں وہ "قافلۂ زندگی" پر کڑی تنقید کرتے لیکن اس سب کچھ کے باوجود مجھ سے ان کی شفقت اور محبت کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ ان دنوں اچھرہ میں میری رہائش تھی۔ شاہ جمال مسجد اور اچھرہ میں فاصلہ بہت کم تھا۔ یوں ہفتے کے دوران میں کم از کم ایک بار ان سے ملاقات ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ میری مصروفیات بڑھ گئیں۔ بعض اوقات ہفتوں ان سے ملاقات نہ ہوتی۔ مجھے ان کی ناراضی کا خدشہ لگا رہتا۔ پھر اچانک ایک روز ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا، آپ کی شفقت آمیز آواز سنائی دی، اصغر آپ تو عید کا چاند ہو گئے، میں معذرت کرتا تو وہ فوراً حاضر ہونے کا حکم صادر کر دیتے۔ اس دوران میں نے نوائے وقت جوائن کر لیا۔ انہوں نے مزاحاً یہ تبصرہ کیا

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

دراصل وہ میرے مسلم لیگی طرز فکر سے سخت نالاں رہتے تھے۔ میں نے جواباً کہا کہ ہم تو غالب کے طرفدار ہیں

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اس پر علوی صاحب خاموش ہو گئے۔ کسی قدر گہری اداسی ان پر چھا گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں ترک تعلقات کی کوئی پرانی کہانی یاد آ گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جمیعت علماء اسلام اور اس کے اکابر کی محبت ان کے دل سے کبھی محو نہ ہو سکی۔ بقول حسرت موہانی۔

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں

میری ان سے آخری ملاقات ان کی وفات سے چند روز پہلے مسجد شاہ جمال میں ہوئی، ہفت روزہ "آج کل" کے مقبول الرحیم مفتی میرے ہمراہ تھے۔ مولانا نے ہمارے لئے خود چائے تیار کی۔ رات کے تقریباً ۱۱ بج رہے تھے جب ہم نے اجازت طلب کی۔ کیا معلوم تھا، علوی صاحب سے یہ آخری ملاقات ہے۔ آئندہ جمعہ میں شاہ جمال مسجد جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ ایک دوست بالکونی پر کھڑا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں بھی سرخیوں پر نظر دوڑانے لگا۔ دفعتاً میری نظر ایک چھوٹی سی خبر پر پڑی۔ مولانا سعید الرحمن علوی انتقال کر گئے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اتنی دیر میں ایک اور دوست کا ٹیلی فون آ گیا۔ وہ مجھ سے خبر کی تصدیق کر رہا تھا اور میں اس سے۔ نہ جانے اس روز کتنے لوگوں کو اس خبر کا یقین نہیں آیا تھا۔

ہلکی ہلکی پھوار اب بوندا باندی میں تبدیل ہو رہی تھی نماز کی ادائیگی کے بعد لوگ باہر نکل رہے تھے اور تیز تیز قدموں سے اپنے گھروں کو جا رہے تھے ہم بھی دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر میں گاڑی لب نہر فراٹے بھر رہی تھی۔ میرے ذہن میں فیض کا یہ شعر گونجنے لگا۔

اب بھی اس راہ سے گزرو، تو کسی دکھ کی کسک ٹوکتی ہے کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی


© rasailojaraid.com